Al-Haqeeqah:Research Journal for Social Sciences (Miscellaneous)
Volume: 02, No: 01. January – June 2022
ISSN: 2790-9298; E-ISSN: 2790-9301

فیض احمد فیض: ایک انسانیت دوست شاعر، تحقیقی جائزہ

Faiz Ahmad Faiz: A Humanitarian Poet, Research Review

*Dr. Hakan Kuyumcu**

Associate Professor, Department of Urdu Language and Literature, Selcuk University, Konya, Turkey.

KEYWORDS

Faiz Ahmed Faiz,
Poetry,
Humanity,
Socialism,
Social justice

ABSTRACT

This article provides a detailed exploration of the life and poetry of Faiz Ahmed Faiz, one of the most prominent poets of the 20th century. Faiz's poetic oeuvre is characterized by a profound commitment to social justice, humanism, and love. Through his verses, he not only critiqued the oppressive systems that perpetuated inequality and suffering but also championed the cause of the marginalized and oppressed peoples worldwide. Whether it was the plight of his own nation or the struggles of African or Palestinian brethren, Faiz's poetry resonated with the universal themes of struggle and resilience. Furthermore, his personal experiences, including imprisonment and exile, added depth to his poetic expressions, infusing them with a sense of authenticity and urgency. Overall, Faiz Ahmed Faiz's legacy serves as a beacon of hope and inspiration, reminding us of the enduring power of poetry to illuminate the human condition and advocate for a more just and compassionate world.

تعارف

انسانی تاریخ میں بعض صدیاں اپنے اندر ہوئی غیر معمولی تبدیلیوں، نئی ایجادات، نظام عالم میں تبدیلیوں اور حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک انسانوں کے افکار کی وجہ سے خاصی اہمیت کی حامل ہو جاتی ہیں۔ بیسویں صدی بھی انسانی تاریخ کی ایسی ہی ایک حیرت انگیز صدی ہے جس میں برپا ہوئی دو عالمی جنگوں نے دنیا کی سماجی، اقتصادی اور سائنسی ہئیت کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ ان جنگوں کی وجہ سے جہاں انسان کی سماجی فکر و سوچ اور زندگی میں تبدیلی ہوئی، فیوڈل نظامِ معیشت کی جگہ سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت نے لے لی۔ صنعتی و مشینی نظام نے ایک طرف تو انسانی زندگی کو آرام دہ اور آسان بنایا لیکن دوسری جانب طبقاتی کشمکش، افلاس، بھوک، استحصالِ زر، غیر منصفانہ اور ناہموار تقسیم جیسے مسائل بھی پیدا کیے۔ جہاں اس صدی میں انسانی سماجی زندگی میں غیر معمولی تغیر آیا بالکل اسی انداز سے انسان کی ادب و فن کی زندگی میں بھی حیرت انگیز ارتقاء و تبدیلی واقع ہوئی تھی کیونکہ ادب بھی بہر حال انسانی زندگی ہی سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس صدی میں دنیا بھر میں بہت سے نامور مفکرین، ناول نگار اور ادیب پیدا ہوئے جنہوں نے ان موضوعات کو مختلف جہتوں سے دیکھا اور ان کے بارے میں لکھا۔ انہی مسائل کو اپنے اشعار کا موضوع بنانے والے برصغیر کے ایک مشہور شاعر فیض احمد فیض تھے۔

حالاتِ زندگی

صوبہ پنجاب میں چناب کے کنارے واقع شہر سیالکوٹ، اپنی دھرتی پر پیدا ہوئے اہل علم کی وجہ سے دنیا بھر میں جانا جاتا ہے۔ مغلیہ عہد کے نامور عالم و ادیب ملا عبدالحکیم سیالکوٹی (1560-1657ء)، گزشتہ صدی میں اردو کے سب سے بڑے شاعر علامہ محمد اقبال (1877-1938ء)، اور پھر اقبال کے بعد اردو کے سب سے بڑے شاعر فیض احمد اسی شہر سیالکوٹ میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ فیض، اقبال کے ہم زبان و ہم ادب ہونے کے ساتھ ساتھ ہم شہر بھی تھے۔ فیض احمد فیض 13 فروری 1911ء تقسیم ہند سے قبل ادب و علم کے ستاروں کے شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ فیض احمد فیض کی والدہ کا نام فاطمہ جبکہ والد کا نام سلطان احمد خان تھا جو کہ خود بھی بیرسٹر تھے۔ کسی زمانہ میں وہ افغانستان حکومت میں چیف سیکریٹری کے عہدہ پر بھی خدمات سرانجام دیتے رہے تھے۔ فیض کی ابتدائی تعلیم کا آغاز قرآن پاک حفظ کرنے سے ہوا کیونکہ اس زمانہ میں عمومی طور پر مسلمان گھرانوں میں بچوں کی تعلیم کی ابتداء قرآن پاک حفظ کرنے سے ہی ہوتی تھی۔ فیض نے چار برس کی عمر میں اپنی والدہ سے چند دعائیں سیکھیں اور حفظ کیں۔ بعد میں پانچ

*Corresponding Author: *Dr. Hakan Kuyumcu*
Email: hkuyumcu@selcuk.edu.tr

برس کی عمر میں والدان کو مکتب لے کر گئے۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ سے ہی حاصل کرنے کے بعد فیض نے اسکاش مشن سکول میں داخلہ لیا۔ جہاں سے 1927ء میں میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ یہ سکول سیالکوٹ کا بہترین سکول تھا اور علامہ اقبال بھی اسی سکول کے ہی تعلیم یافتہ تھے۔ 1929ء میں انٹر کا امتحان بھی سیالکوٹ کے مرے کالج سے درجہ اول میں پاس کیا۔ 1931ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور پھر عربی میں آنرز کیا۔ 1933ء میں لاہور کالج سے ہی ایم اے انگریزی کرنے کے بعد 1934ء میں اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں ایم اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ 1935ء میں ایم اے او کالج امرتسر میں لیکچرار مقرر ہوئے۔(فیض احمد۔1977ء)۔ فیض جب لاہور میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اس عہد میں رومانی شاعری عروج پر تھی۔ بالخصوص حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی عوام میں خاصے مقبول تھے۔ فیض اپنے گھر کے قریب کتابوں کی دوکان سے کرایہ پر کتب لا کر پڑھتے رہتے تھے۔ فیض نے انہی دنوں اردو نثر میں بالخصوص رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر کی تقریباً سبھی کتب کا مطالعہ کر لیا تھا۔

فیض کے خیالات میں انقلابی تبدیلیاں

امرتسر میں ہی ان کی ملاقات افسانہ نگار محمود الظفر اور انکی زوجہ ڈاکٹر رشید جہاں سے ہوئی۔ دونوں میاں بیوی ترقی پسند اور مارکسسٹ تھے۔ انہوں نے ہی فیض کی ملاقات ترقی پسند تحریک کے بانی سید سجاد ظہیر سے کروائی تھی۔ ڈاکٹر رشید جہاں نے انہیں کمیونسٹ مینی فسٹو پڑھنے کو دیا جس سے ان کے خیالات میں انقلابی تبدیلی آئی۔ مزید آگے چل کر یہ شناسائی اور ملاقاتوں کا فیض پر گہرا اثر ہوا اور وہ مارکسزم کے خیالات سے متاثر ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ 1936ء میں ترقی پسند مصنفین کی ایک شاخ لاہور میں کھول دی گئی جس کا سب کام فیض نے ہی کیا تھا۔(فیض احمد۔41)۔

اس کے بعد فیض نے عشقیہ ورومانوی شاعری کی بجائے، غریبوں، مفلسوں، حاجت مندوں اور مفلوک الحال بے چارے عوام کے لیے شاعری کہنا شروع کر دی۔ جس کی بدولت جلد ہی انہیں عوامی شاعر کہا جانے لگا تھا۔ انہی دنوں فیض نے لاہور سے شائع ہونے والے ادبی پرچہ "ادبِ لطیف" کی ادارات کا کام سنبھالا لیا۔ فیض کی ادارت کے دوران بہت سے ترقی پسند مصنفین کے مضامین اس ادبی پرچہ میں چھپنے کی وجہ سے ترقی پسند ادب کو اچھا خاصا فروغ حاصل ہوا۔ ان دنوں ایم اے او کالج امرتسر کے پرنسپل ڈاکٹر تاثیر تھے جو کہ ایک غیر ملکی خاتون سے شادی شدہ تھے۔ ان کی سالی ایلس کیتھرین جارج اپنی بڑی بہن کو ملنے امرتسر آئیں جہاں ان کی ملاقات فیض سے ہوئی۔ ایلس جارج بھی فیض ہی کی طرح ترقی پسند خیالات رکھنے والی خاتون تھیں۔ چنانچہ چند ملاقاتوں اور خیالات کی ہم آہنگی کی وجہ سے دونوں ترقی پسند خیالات کے حامل شخصیات نے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ایلس کا اسلامی نام "کلثوم" رکھا گیا اور فیض ان سے 28 اکتوبر 1941ء کو سری نگر کشمیر میں رسم نکاح کے بعد رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ایلس اور فیض کی دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ اگرچہ فوجی ملازمت اور مسلسل قید و بند کی وجہ سے فیض اپنی بیٹیوں کا بچپن نہیں دیکھ سکے تھے جس کا انہیں شدید دکھ بھی تھا،(فیض احمد۔50)۔ شادی کے اگلے ہی برس فیض نے فوج میں ملازمت اختیار کر لی جہاں پر کرنل کے عہدے پر پہنچ کر 1947ء میں مستعفی ہو کر لاہور آ گئے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین سے آشنائی اور تقسیم ہند

فیض کی نسل کا ایک دکھ جس نے اس نسل کو سب سے زیادہ گھاو لگایا وہ مذہب کے نام پر ملک کی تقسیم، قتل و غارت اور پرتشدد واقعات سے ان کے ملک کو رنگین کر دینا تھا۔ اس نسل کو اپنے بچپن، لڑکپن یا جوانی کے ایام گزارے ہوئی یادوں، ان دوستوں، زمینوں اور شہروں کو چھوڑ کر ہجرت کرنا پڑی تھی۔ مزید برآں جس صبح کی امید ان مفکرین کو تھی وہ صبح تو طلوع ہی نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی مشہور غزل "صبح آزادی" میں اس امید اور پھر امید کے ٹوٹنے کا ذکر بڑے ہی دل پارہ الفاظ میں کرتے ہیں۔

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

اس مظلوم و مقہور نسل کا جوانی کا دور بڑا پر آشوب دور تھا۔ مسلسل جنگوں کی وجہ سے دنیا شدید ترین اقتصادی بحران کا شکار تھی۔ غلام ہندوستان کی معیشت شدید مشکلات کا شکار تھی۔ غلامی کے بعد اب بھوک اور افلاس نے عوام کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ ایسے دور میں سماج کے ان راندہ درگاہ لوگوں کے مصائب، پریشانیاں، ان پر کیے جانے والے مظالم اور ان کی تکالیف کو معاشرہ کے سامنے لانے کے لیے ترقی پسند مصنفین نے قلم اٹھایا۔ ان مصنفین میں پریم چند، حسرت موہانی اور مولوی عبدالحق جیسے لوگ شامل تھے۔ ان ترقی پسند مصنفین نے خصوصی طور پر شعوری سطح پر مذہبی استحصال اور اقتصادی پسماندگی کے خلاف قلم کو جنش دی۔ فیض بھی اس تحریک میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن میں مکمل طور پر شریک اور پیش پیش تھے۔

پاکستان کے قیام کے بعد فیض کو دہلی سے لاہور آنے پر پاکستان ٹائمز کا چیف ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا۔ سر گرم اور ترقی پسند فیض احمد فیض چیف ایڈیٹری کے ساتھ ساتھ صحافیوں کی انجمن اور ڈاک خانے کے ملازمین کی ٹریڈ یونین کے کاموں میں بھی خاصی سرگرمی سے حصہ لیتے رہے تھے۔ ویسے تو جمہوریت ساری تیسری دنیا میں عمومی طور پر اور اسلامی دنیا میں خصوصی طور پر لولی لنگڑی ہو کر ہی چلتی رہی ہے۔ ان ممالک میں بار بار فوجیوں نے منتخب حکومتوں کا تختہ الٹ کر خود حکومتوں پر قبضہ کر لینے کی روایت عام ہے۔ البتہ کبھی کبھار یہ کوششیں ناکام بھی ہوئی ہیں۔ پاکستان کی ابتدائی جمہوری تاریخ میں "راولپنڈی سازش کیس" کی بازگشت ہمیں خوب سنائی دیتی ہے۔ فروری 1951ء میں اس وقت کے آرمی چیف آف جنرل سٹاف، میجر جنرل اکبر خان کی سربراہی میں بعض فوجی افسران پر لیاقت علی خان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی منصوبہ بندی کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس کیس میں دیگر فوجی افسران کے ساتھ ساتھ فیض کو معاونت کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور اگلے چار سال وہ پاکستان کی مختلف جیلوں میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ ان سالوں کی قید میں تین ماہ تنہائی کی قید بھی شامل تھی۔ فیض کے دیوان "زندان نامہ" کی بہت سے نظمیں اس قید تنہائی میں لکھی گئی تھیں۔ 1958ء میں جب جنرل ایوب خان نے پاکستان میں پہلا باقاعدہ مارشل لاء لگایا تو فیض کو حفاظتی تحویل میں لے لیا گیا۔ البتہ پانچ ماہ بعد انہیں رہا کر دیا گیا۔ بعد انہیں گورنمنٹ کالج میں انگریزی کی پروفیسری کی پیش کش کی گئی لیکن انہوں نے اس کو قبول کرنے سے معذرت کر لی۔ البتہ لاہور آرٹ کونسل کی سربراہی کو قبول کر لیا۔ (فیض احمد۔ 1997)۔ 1962ء میں انہیں لینن امن انعام دیا گیا۔ جس پر پاکستان کے بعض اخبارات میں ان پر خوب تنقید کی گئی۔ حتیٰ کہ گورنر پنجاب نواب کالاباغ نے بھی انہیں تنگ کرنا شروع کر دیا۔ جس پر فیض دل برداشتہ ہو کر لندن چلے گئے۔ فیض نے جلاوطنی میں ہی یہ کہا تھا :

اب کے برس دستورِ ستم میں کیا کیا باب ایزاد ہوئے
جو قاتل تھے مقتول ہوئے، جو صَید تھے اب صیاد ہوئے
فیضؔ، نہ ہم یُوسف نہ کوئی یعقُوب جو ہم کو یاد کرے
اپنی کیا، کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے

1964 میں لندن سے وطن واپسی پر انہیں عبداللہ ہارون کالج کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا۔ جب ذوالفقار علی بھٹو بر سر اقتدار آئے تو فیض احمد فیض کو پنڈی بلوایا گیا اور انہیں فروری 1972ء کے اوائل میں نیشنل کونسل آف دی آرٹس کا چیرمین مقرر کر دیا گیا۔ ان حکومتی ذمہ داریوں کی وجہ سے فیض، کراچی سے اسلام آباد منتقل ہو گئے۔ چار سال اس عہدہ پر برقرار رہے اور ایک بار پھر سے ملکی حالات خراب ہوتے ہی عہدہ سے علیحدہ ہو کر اسلام آباد سے لاہور آ گئے۔ جنرل ضیاء الحق نے ملکی حالات کا بہانہ بنا کر 1977ء میں حکومت کا تختہ الٹ کر خود اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ فیض نے بھی ان دنوں مشکل حالات گزارے کیونکہ انہیں بھی بھٹو کا طرفدار خیال کرتے ہوئے خفیہ ایجنسیوں نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ جس سے تنگ آکر فیض نے افروایشین رائٹرز کے ترجمان رسالے "لوٹس" کی ادارت قبول کر لی اور بیروت چلے گئے۔ چنانچہ فیض کی اس جلاوطنی اور احساسات بارے ڈاکٹر آفتاب احمد لکھتے ہیں:

حکومت کی مختلف خفیہ ایجنسیوں نے پھر ان پر عرصہ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا۔ کچھ مشکوک قسم کے لوگ لاہور میں ان کے گھر کے آس پاس گھومنے لگے۔ وہ باہر نکلتے تو ایک جیپ ان کے پیچھے لگی رہتی۔ فیض اب عمر کی اس منزل میں تھے کہ ان سے اس قسم کی ناروا کارروائی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ انہیں سخت کوفت ہونے لگی۔ چنانچہ انہوں نے افروایشین رائٹرز کے رسالے لوٹس کی ایڈیٹری قبول کر کے ملک سے باہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ فروری 1978ء کے شروع میں وہ ایک دن ایلس کے ساتھ پنڈ میں ہمارے ہارلے سٹریٹ والے گھر آئے۔ چند منٹ سے زیادہ نہیں بیٹھے۔ کہنے لگے: "ہم شام کی فلائٹ سے کراچی جا رہے ہیں اور وہاں سے رات کو لندن۔ بس تمہیں خدا حافظ کہنے

آئے ہیں۔ اب دیکھو کب ملاقات ہوتی ہے۔ پھر شمیم اور ہماری دونوں بچیوں کو اور مجھے پیار کیا اور رخصت ہو گئے۔ اس دن واقعی فیض بہت گرفتہ دل اور اداس نظر آ رہے تھے۔" (نازک۔242) اگلے تین برس انہوں نے بیروت میں گزرائے۔ لبنان میں اس قیام کے دوران انہوں نے دنیا کے مختلف ملکوں کی سیر کی، دنیا کے مختلف مفکرین سے ملاقاتیں کیں اور مختلف کانفرسوں میں شرکت بھی کی۔ جنوری 1982ء کو پاکستان واپس آ گئے۔ زندگی کے آخری دنوں میں فیض دمہ کے عارضہ میں مبتلا ہو گئے تھے جو کہ ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ غالب اور اقبال کے بعد اردو کے یہ عظیم شاعر 20 نومبر 1984ء کی دوپہر 01:15 پر لاہور کے میو ہسپتال کے میں وفات پا گئے۔ یوں اقبال کے ہی شہر سیالکوٹ میں پیدا ہونے والے فیض، اقبال ہی کی طرح لاہور میں فوت ہوئے۔

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جارہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے
ویراں ہے میکدہ، خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ رُوٹھ گئے دن بہار کے
بُھولے سے مسکرا تو دئے تھے وہ آج فیض
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

فیض احمد فیض حقیقی معنوں میں ایک عظیم، متحرک اور فعال انسان تھے۔ انھوں نے رومانوی، عشقیہ شاعری کی بجائے سماج میں پنجے گاڑھی ہوئی غربت، بھوک مری، بے روزگاری اور ظلم واستبداد کے خلاف طاقت ور آواز اٹھائی۔ فیض نے نہ صرف مفکرانہ کام کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اردو زبان کو بھی دنیا بھر میں متعارف کروایا۔ انہوں نے اردو زبان میں شاعری کرتے ہوئے ایک طرف تو اردو کو کمال تک پہنچایا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتلایا کہ سچی شاعری کسی ایک قوم، خطہ یا زمانہ کے ساتھ خاص نہیں ہوتی بلکہ اس کے مخاطبین ہر اس سماج کے لوگ ہوتے ہیں جہاں ناانصافی اور استبداد موجود ہو۔ فیض کے ذاتی نجابت، رواداری، تحمل، شریف النفسی، اخلاق واخلاص نے ایک دنیا کو ان کا دیوانہ بنا رکھا تھا۔ فیض طبعی طور پر شرمیلے اور خاموش طبع انسان تھے۔ انہوں نے کبھی بھی زندگی سے مایوس ہو کر شکوہ یا شکایت نہیں کی تھی۔ حکومتِ پاکستان نے فیض کو بعد از وفات نشانِ امتیاز کا اعزاز عطا کیا۔

نگارشات

فیض نے نظم ونثر دونوں صورتوں میں کئی یادگار مجموعہ جات چھوڑے۔ جو معاشرہ کے مظلوم لوگوں کی آواز بن کر ہمیشہ ظالموں کے سامنے پڑھے جاتے رہیں گے۔ فیض کی نگارشات حسبِ ذیل ہیں:

نمبر شمار	نام	سنِ اشاعت
1	نقش فریادی	1941ء
2	دست صبا	1952
3	زنداں نامہ	1956ء
4	دستِ تہہ سنگ	1965ء
5	سر واری سینا	1971ء
6	شامِ شہر یاراں	1978ء
7	میرے دل مرے مسافر	1981ء
8	کلیات مہ وسال آشنائی	1980ء
9	کلام فیض	1982ء

نسخہ ہائے وفا 10

فیض احمد فیض کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "میزان" 1962 میں احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وحید قریشی کی اعانت سے شائع ہوا۔ اسی طرح مختلف اوقات میں فیض کی جانب سے لکھے گئے خطوط کا مجموعہ 1971ء میں "صلیبیں مرے دریچے کی" عنوان سے شائع ہوا۔ فیض کا ایک سفر نامہ بھی 1974ء میں طبع ہوا تھا۔

رومانوی شاعری سی حقیقی دنیا کی جانب سفر

ایسے معاشرے جہاں پر غربت، بے روزگاری، جہالت زیادہ ہو ایسے معاشروں میں مذہبی رجحانات اور رومانویت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ برطانوی ہندوستان میں یہ سبھی عناصر اس وقت کے معاشرے کی جڑوں تک سرایت کیے ہوئے تھے۔ ایسے وقت میں فیض نے اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا۔ اگرچہ جب فیض نے شاعری کا آغاز کیا تھا اس وقت حسرت موہانی اور اختر شیرانی کی رومانوی شاعری عروج پر تھی۔ ن۔م راشد بھی شاعری کا آغاز کر چکے تھے۔ البتہ فیض کو دیگر شعراء سے کسی حد تک فائدہ دینے والا عنصر ان کا انگریزی ادب کا خاصا وسیع مطالعہ تھا۔ فیض انگریزی ادباء میں سے ایلیٹ، ایذرا پاؤنڈ، براوننگ وغیرہ سے اچھے خاصے متاثر تھے۔ فیض نے بھی اپنے عہد کی ادبی فضا کے موافق ابتداء میں رومانوی شاعری سے ہی اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا لیکن جلد ہی وہ رومان سے حقیقت کی طرف آ گئے تھے۔ 1936ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں منعقدہ ایک مشاعرہ میں ڈاکٹر تاثیر، صوفی تبسم، عابد علی عابد، چراغ حسن حسرت، احسان دانش وغیر ھم جیسے اس عہد کے مشہور شعراء موجود تھے۔ فیض نے جب ان شعراء کی موجودگی میں یہ مندرجہ ذیل اشعار پڑھے تو ساری محفل جھوم اٹھی۔ اشعار کچھ یوں تھے:

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے (فیض احمد 2009ء)

کہا جاتا ہے کہ جیسے ہی فیض نے یہ اشعار پڑھے ساری محفل ان سے آشنا ہو گئی اور فیض نے خوب داد وصول کی۔ اگرچہ یہ فیض کی شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا، لیکن باوجود رومانویت کی آب و ہوا کے فیض نے رومان اور حقیقت کے حسین امتزاج سے اپنی نظموں اور غزلوں کا آغاز کیا اور وقت کے ساتھ ساتھ حقیقت اور انسانیت کے دکھوں کی طرف آتے چلے گئے۔ گو کہ رومانویت کی چاشنی کے بغیر شاعری بے لطف سی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ دنیا کے تمام بڑے شعراء کے یہاں رومان کی چاشنی موجود رہتی ہے۔ حتیٰ کہ اقبالؔ جیسا فلسفی شاعر کہ جس کی شاعری کا ایک خاص مقصد اور پیغام دنیا تھا اس شاعر کے ہاں بھی رونویت کے عناصر اچھی خاصی حد تک موجود ہیں۔ چنانچہ فیض نے زندگی کی تکالیف، دکھوں اور تلخ حقیقتوں کو رومانوی عناصر کے ساتھ ملا کر انتہائی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اپنے عہد کے حالاتِ زبوں، سیاسی، سماجی اور اقتصادی معاملات کی سمجھ بوجھ جتنی فیض کو تھی اس عہد کے بہت کم شعراء ان معاملات کا اتنا علم رکھتے تھے۔

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں
یوں ہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل برا نہیں کرتے (فیض احمد: 161)

اسی کتاب میں انکی مندرجہ ذیل نظم بھی کچھ ایسے ہی مفہوم کو ادا کرتی ہے۔

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم (فیض احمد: 127)

ایک دوسری نظم میں فیض نے کہا تھا:

موتی ہو کہ شیشہ جام کہ در
جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا سو چھوٹ گیا (فیض احمد: 166)

فیض کی بہت سی نظمیں اور غزلیں ایسی ہیں جن میں ایک طرف تو وطن سے بے پناہ محبت کا اظہار ہوتا ہے جب کہ دوسری جانب نظام کی جبریت کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ فیض نے وطن کو نگار بنا کر اس سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اسی طرح معاشرے کے نشیب و فراز، مادی اور معاشی ناہمواریوں، سماجی حقیقتوں کی تلخیوں کو نقش فریادی، دست صبا اور زنداں نامہ تینوں مجموعوں کے کلام میں موضوع بنایا لیکن فیض نے تلخیوں کی عکاسی کے ساتھ ساتھ بیداری اور روشن مستقبل کی امید بھی دلائی ہے۔ مثلاً "چند روز اور مری جان"، "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں"، "زنداں کی ایک صبح"، "اے روشنیوں کے شہر بتا"، "اے دلِ بے تاب ٹھہر" وغیرہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ نقشِ فریادی میں فیض نے حال کے حقائق کو زیادہ پیش کیا جبکہ دستِ صبا اور زنداں نامہ میں ملکی حالات، اپنے عہد کے حقائق کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے بغاوت کے جذبہ کو بھی ابھارا ہے۔ فیض کی پوری شاعری میں انتظار کی ایک کیفیت جاری وساری نظر آتی ہے۔ فیض کو اگرچہ موجودہ حالات کٹھن محسوس ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں انتظار اور امید ہے ایک روشن مستقبل کی، آزاد جمہوری معاشرے کی اور ایک آزاد فکر والے سماج کی۔ "صبحِ درخشاں کا"، "صبح آزادی"، "دو آوازیں"، "ملاقات"، "درد آئیگا"، "دبے پاؤں"، "ہم لوگ، تنہائی"، "اے دل بے تاب ٹھر" وغیر ہم نظموں میں ان کیفیات کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔

اس منظر نامہ اور فیض کی مندرجہ بالا نظموں، ان میں چھپے ہوئے درد، احساسات اور پیغام کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ فیض کی شاعری کا آغاز تو رومانی فضا، موسیقیت، غنائیت، ندرتِ احساس، رنگین، تخیل اور رومانی تجربات سے ہوا تھا لیکن وہ جلد ہی ان رومانوی اور رنگین خیالات اور تجربات سے حقیقی اور تلخ تجربات کی طرف لوٹ آئے تھے۔ یعنی غم عشق سے غم دوراں یا غم جہاں کی طرف مراجعت کر لی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ فیض احمد فیض ایک مخصوص نصب العین رکھنے والے شاعر تھے۔ فیض کے ہاں ارضیت کے حوالہ جات ملتے ہیں ماورائیت کے نہیں۔ انہوں نے ہمیشہ معروضی رویہ کو اپنایا تھا۔ معاشرے کے عوامل اور معمولات کا سائنی تجزیہ کیا۔ وہ انسان کی آزادی کے شاعر ہیں۔ فیض کا زمانہ ناموافق اقتصادیات کا زمانہ تھا۔ غلام ملک میں بھوک، افلاس، بیماری اور بے روزگاری عوام کا مقدر تھی۔ فیض نے ان سب تلخ تجربات کو اپنے کلام میں بہت ہی عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی نظم و غزل دونوں میں یہ درد اور دکھ سرایت کیے ہوئے نظر آتا ہے۔ انہوں نے نظم کو غزل کے لہجہ میں پیش کیا اور غزل کو نظم کی مثل کا ربط دیا۔ مندرجہ ذیل غزلوں اور نظموں کو دیکھیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے

ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اسی درد کو فیض نے اپنی ایک دوسری غزل میں یوں زبان دی:

نہ گنواؤ ناوک نیم کش دل ریزہ ریزہ گنوا دیا

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تن داغ داغ لٹا دیا

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے

رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

ابھی اس کرب کو ایک دوسرے شعر میں ملاحظہ کریں:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا

وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

موجودہ حال کی سختی اور اچھے مستقبل کی امید لیے ہوئے ان کے مندرجہ ذیل اشعار بھی قابل ذکر ہیں:

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز

ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم

اور کچھ دیر ستم سہہ لیں تڑپ لیں رولیں

اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں

اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

بیسویں صدی کی اردو شاعری میں اقبال کے بعد جس شاعر نے عوامی مسائل کے لیے ایک مقصدی شاعری کی ہے ان میں فیض کا نام سر فہرست ہے۔ انہیں یہ مرتبہ حکومتی سرپرستی کی وجہ سے نہیں بلکہ عوام میں ان کی مقبولیت کے باعث ملا تھا۔ عوام کے دکھوں، ان کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کو زبان دینے کی وجہ سے ہی فیض ہمیشہ حکومتوں کے معتوب رہتے تھے۔ کیونکہ فیض اپنی شاعری میں سسکتی ہوئی قریب المرگ عوام کی زندگی کے دکھوں اور پریشانیوں کی ترجمانی کرتے تھے۔ بھلا استحصال کرتی ہوئی حکومتیں انہیں کیونکر برداشت کر سکتی تھیں۔ فیض نے جزا اور سزا کے خوف کے بغیر مظلوموں کے حق میں لکھا اور اپنے خیالات کو خوبصورت شعروں کی صورت میں یوں ڈھالا کہ وہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرتے چلے گئے۔ فیض کا یہی ذہنی وشعوری جذبہ ہی تھا جس کی وجہ سے وہ اس دور میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے اور ان کے ساتھ ملکر ترقی پسند ادباء نے پہلی بار استحصالی نظام اور اس کی اقدار کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ فیض نے اپنی تحریروں میں ظالموں کے خلاف اور مظلوموں کے حق میں آواز بلند کی۔

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے

جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

ہاں تلخی ایام ابھی اور بڑھے گی

ہاں اہل ستم مشق ستم کرتے رہیں گ

اک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک

اک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

یہ فیض ہی کا اعجاز ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کے محروم طبقوں کی آواز اور آرزوئیں اپنی شاعری کے ذریعے بہت ہی عمدہ طریقہ سے سماج تک پہنچائی ہیں۔ عتیق احمد نے فیض کی شاعری پر درست تبصرہ کیا ہے کہ "فیض کی شاعری کا بڑا وصف یہ ہے کہ انہوں نے قوم پر ہر دورِ ابتلاء میں وہ سب باتیں اور وارداتیں اپنی گرفت میں لیں اور اپنی شاعری میں

انہیں ریکارڈ کر دیا۔"(عتیق احمد: 1985ء)عتیق احمد نے فیض کی شاعری کا رومانویت سے تلخ حقائق کی جانب سفر کا خوب انداز میں مطالعہ کرتے ہوئے فیض کی تصنیف "دستِ صبا" سے ان میں حقیقی تبدیلی رونما ہونے کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں "دستِ صبا کے ساتھ فیض کا ایک نیا اور حقیقی جنم ہوتا ہے۔ فیض یہاں سے اپنا ضمیر پا لیتے ہیں۔ صحیح معنوں میں یہاں سے جبر واستحصال کے محور پر گردش کرتا ہو نظام، اربابِ حل و عقد کی سالوس، اقتصادی نابرابری کے پس پشت کام کرنے والی انسان دشمن طاقتیں، فاشٹ قوتوں کی جہاں گیر سازشیں، انسانی معاشرے کے تضادات ان کی فہم کا حصہ بن جاتے ہیں۔ حقیقت سے ایک نیا تخلیقی رشتہ قائم کر لیتے ہیں کہ زندگی کے مسائل فن کی حرمت کو مجروح نہ کر سکیں۔

وہ زندگی کے حقائق کا جدلیاتی اور اور تغیراتی فطرت کا فہم رکھتا ہے۔"(فیض احمد: 1988ء)عتیق احمد نے اگرچہ دستِ صبا کے حوالہ سے یہ بات کہی ہے لیکن یہ تجزیہ ان کی بعد کی شاعری پر بھی پورا اترتا ہے۔اسی طرح فرزانہ سید کا یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ "فیض احمد فیض اپنے نظریات ور جحانات کو شاعری کی زبان میں بیان کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں اور سلیقہ بھی۔ وہ اسی حوالے سے محنت کش مزدور اور کسان کے جذبات کی بھی صحیح صحیح ترجمانی کرتے ہیں اور سماجی مساوات کے حصول کی راہ میں ممکنہ حائل رکاوٹوں کی نشان دہی بھی کر دیتے ہیں۔"(فیض احمد: 1986ء)

فیض اور فلسطین

گزشتہ صدی کے اوائل اور نصف کے لگ بھگ سالوں میں انسان دو عالمی اور خونخوار جنگیں لڑ چکا ہے۔ جس میں اس نے اپنی ہی جنس کے کروڑں لوگوں کو پل بھر میں موت کی نیند سلا دیا یا پھر بلک بلک کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔امید تو یہ تھی کہ ان جنگوں کے بعد انسان سبق سیکھ کر آئندہ ایسی حماقت نہیں کرے گا لیکن بجائے درس لینے کے اس نے دوسرے لوگوں کو قتل کرنے کے مزید مہلک ہتھیار اور نت نئے طریقے دریافت کرنے میں جٹ گیا۔اسلحہ کے تاجروں، اپنی طاقت منوانے کے زعم میں مبتلاء چند جنگجوؤں، وقتی وسیاسی مفادات کی خاطر اقوام کو جنگوں میں جھونک دینے والے سیاستدانوں نے یہ بازار آج بھی پورے زور وشور سے برپا کر رکھا ہے۔ آج جب کہ میں یہ مقالہ تحریر کر رہا ہوں انسانیت کی تذلیل، قتل و غارت، لوٹ مار سمیت ہر طرح کا ظلم دنیا کے کئی خطوں میں برابر جاری ہے۔ان خطوں میں سے فلسطین میں جو ظلم وستم اور نسل کشی کی جارہی ہے شاید انسانی تاریخ میں اس کی نظیر مشکل سے ملے۔ یہ سلسلہ عرصہ دراز سے چل رہا ہے۔ فیض جب لبنان گئے تو انہوں نے فلسطین واسرائیل کے تنازعہ اور قتل غارت کو انتہائی قریب سے دیکھا اور اپنی شاعری میں کئی نظمیں مظلوم فلسطینوں کے لیے لکھیں۔ اگرچہ برصغیر کے مسلمانوں کے ساتھ بالخصوص حتیٰ ساری دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ تاریخ میں چند ایک واقعات کے سوا عمومی طور پر یہود قوم کے ساتھ تعلقات اچھے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ جب پندرہویں صدی کے آخر میں یہودیوں کو یورپ سے نکالا گیا تو عثمانی سلاطین اور ہندوستان میں اکبر اعظم نے دیس نکالے ہوئے یہودیوں کی آباد کاری کے لیے ہر طرح کی ممکن کوشش کی تھی۔ باوجود اس کے کہ بھری تاریخ میں یہودی قوم کے دوست سے زیادہ دشمن موجود رہے ہیں لیکن پھر بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی براہ راست کبھی قوم یہود سے کوئی جنگ نہیں ہوئی۔

فیض کا تعلق بھی خطہ برصغیر سے ہے۔انہوں نے قوم یہود کے خلاف شاعری نہیں کی لیکن فیض نے ہمیشہ مظلوموں کے حق میں شاعری کی ہے۔ یہ مظلوم خواہ ان کے اپنے ملک کے ہوں، خواہ وہ مظلوم افریقی ہوں، ایشائی یا فلسطینی۔ حتیٰ کہ فلسطین کے ساتھ تو فیض کا خاص تعلق رہا ہے۔ لوٹس کی ایڈیٹری کے دوران انہیں بیروت میں رہنے کا موقع ملا، اس عرصے میں وہ مجاہدین کے ٹھکانوں پر بھی گئے۔ جنگ کے دوران بھی جب ہر طرف تباہی و بربادی کر دی گئی تھی فیض نے ان حالات میں بھی بیروت چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔اس وقت کے فلسطین کے صدر یاسر عرفات کے ساتھ ان کی خاص دوستی تھی۔ یاسر عرفات نے فیض کے بارے میں ایک بار کہا تھا "فیض احمد فیض میرے دوست تھے اور جنگ بیروت میں میرے رفیق تھے۔اس دہکتے جہنم میں بھی ان کے چہرے کی لازوال مسکراہٹ ماند نہ پڑی۔"(فیض احمد: 1985ء)اپنی آنکھوں سے دیکھے فلسطین میں کیے گئے مظالم نے ان کی سوچ و فکر پر اثرات مرتب کیے جو فلسطین کے حوالہ سے ان کی لکھی ہوئی مختلف نظموں میں ہمیں نظر آتے ہیں۔ "فلسطینی بچے کی لوری"، "فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے"، "کیا کریں بیروت"۔۔۔۔ وغیرہ جیسی کئی نظمیں ان کی فلسطین اور مظلوم فلسطینوں سے محبت کا بین ثبوت ہیں۔

فیض احمد فیض کو ان کی شاعری، مظلوموں کے لیے آواز بلند کرنے کی وجہ سے اپنی زندگی میں ہی عالمی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ انہیں یہ شہرت ان مظلوموں طبقوں بارے آواز اٹھانے پر بجا طور پر حاصل ہوئی تھی۔ قید و بند سے عبارت ان کی ذاتی زندگی ہو یا شاعری۔۔۔ ان کے آدرشوں کی ترجمان اور عکاس رہی ہے۔ ترکی کے شعراء

میں سے اگر کسی شاعر کو فیض سے مناسب اور مماثلت دی جاسکتی ہے تو وہ ترکی کے عظیم ترقی پسند شاعر ناظم حکمت ہیں۔ میں اس مقالہ کا اختتام ڈاکٹر اے بی اشرف کے ناظم حکمت پر تحریر کیے گئے ایک مقالے کے اقتباس پر اختتام کرتا ہوں۔ ڈاکٹر اے بی نے فیض احمد فیض اور ناظم حکمت کے درمیان مماثلت پر بات کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

فیض اور ناظم حکمت میں خاصی مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں بیسویں صدی کے اہم شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ دونوں سوشلسٹ نظریات کے حامل اور اشتراکیت کے زبردست مداح اور پیروکار تھے۔ دونوں نے قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ ناظم کی زندگی کے بہترین سال جیلوں میں گزرے۔ دونوں کو زندگی کا کافی حصہ وطن سے دور جلاوطنی میں بسر کرنا پڑا۔ دونوں وطن پرست اور نگارِ وطن کے عاشق اور دلدادہ تھے۔ دونوں معاشرتی، اقتصادی اور سماجی انصاف اور عدل و مساوات کا پرچار کرتے رہے۔ انسانی اقدار کی پامالی اور سرمایہ داری نظام کے استحصال پر دونوں نے احتجاج کیا۔ دونوں محنت کش طبقے، مزدروں اور غریبوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے رہے۔ دونوں نے ظلم واستبداد اور آمریت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ دونوں حسن پرست اور عشق پیشہ شاعر تھے۔ رومان کی چاشنی دونوں میں موجود تھی۔"(اشرف:2003ء)

محتسب کی خیر اونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا ساقی کا مے کا خم کا پیمانے کا نام
ہم سے کہتے ہیں چمن والے غریبان چمن
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

خلاصہ البحث

فیض احمد فیض کی شاعری اور زندگی کا جائزہ لینے پر ہمارے سامنے ایک بہت گہری سوچ کی حامل مثالی شخصیت ابھرتی ہے۔ ان کی شاعری میں انسانیت، انصاف، اور محبت کی اہمیت کو وضاحت کے ساتھ خصوصی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ان کے کلام میں مظلوموں کے حقوق کی دعوت اور انصاف کے لیے جدوجہد کا موضوع عام ہے۔ فیض احمد فیض کی شاعری سے یہ بھی درس نکالا جاسکتا ہے کہ شاعری انسانیت کو ایک دوسرے کی مدد اور حمایت کرنے کے لیے جوڑنے کے لیے موثر ذریعہ ہو سکتی ہے۔ ان کی زندگی کے تجربات، جیل میں قید و بند کی صعوبتیں اور ملک بدری نے ان کی شاعری کو اور بھی گہرا بنایا اور اسے معاشرتی اور سماجی مسائل کے حل تلاش کرنے کی طرف مائل کیا۔ ان کے اشعار فکریت اور انسانیت کی خدمت میں ایک نئی روشنی لاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں غریبوں، مظلوموں، اور معاشرے کے کمزور طبقوں کے حقوق کی آواز بلند کی گئی ہے۔ ان کی شاعری ہمیں امید دیتی ہے کہ اگر ہم محنت کریں اور انصاف کی دعوت دیں تو ہم ایک بہتر اور دیانت دار دنیا کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ فیض احمد فیض کا ورثہ ایک بے مثال روشنی کی منبع ہے جو ہمیں ہمیشہ راہنمائی اور انتہائی اہم نصیحت فراہم کرتا رہے گا۔

مصادر اور مراجع

احمد، وصی، "انقلابی شاعر فیض احمد فیض"، ناشر نسیم انہونوی، دہلی 1977ء۔

Ahmad, Wasi, "Inqilabi Sha'ir Faiz Ahmad Faiz", Nasher Naseem Anhonevi, Delhi 1977.

صابر دت، "فیض احمد فیض،، شخصیت اور فن"، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی 1981ء۔

Sabir Dat, "Faiz Ahmad Faiz, Shakhsiyat aur Fun", Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Delhi 1981.

احمد، آفتاب، "بیاد صحبتِ نازک خیالاں، مضمون بر فیض احمد فیض"، مکتبہ دانیال کراچی 1997ء۔

Ahmad, Aftab, "Yad-e-Sahbat-e-Nazuk Khayalain, Mazmoon Bar Faiz Ahmad Faiz", Maktaba Daniyal Karachi 1997.

فیض، احمد فیض، "کلیات، نسخہ ہائے وفا"، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، نیو دہلی 2009ء۔

Faiz, Ahmad Faiz, "Kulliyat, Nuskha-e-Haye Wafa", Educational Publishing House, New Delhi 2009. Ahmad, Atiq, "Adab-e-Lateef, Faiz Number 1985", Vol 51, Number 3-4.

احمد، عتیق، "ادب لطیف، فیض نمبر 1985ء"، ج 51، نمبر شمار 3-4۔

Mahli, Shahid, "Faiz Ahmad Faiz... Akas aur Jihatein", Mavra Publishers, Lahore 1988.

ماہلی، شاہد، "فیض احمد فیض۔۔۔ عکس اور جہتیں"، ماورا پبلشر، لاہور 1988ء۔

"Nuqoosh-e-Adab" Sang-e-Meel Publications, Lahore 1986, p. 447.

" نقوش ادب "سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور 1986ء، ص 447۔

Ali, Hafiz Aamir, "Jews in Mughal India: Historical Perspectives and Cultural Interactions", Inkishaf, 4/11 (2024), 20-35.

Ali, Hafiz Aamir, Jews in Mughal India: Historical Perspectives and Cultural Interactions, Inkishaf, 4/11 (2024), 20-35.

ادبِ لطیف، فیض نمبر، 1985، ج 51، ش 3-4۔

Adab-e-Lateef, Faiz Number, 1985, Vol 51, Issue 3-4.

اشرف، اے بی، "عشق پیشہ، انقلابی شاعر۔۔۔ناظم حکمت، ارتکاز، کراچی 2003ء، 3-4، ص 36۔

Ashraf, A.B., "Ishq Peshwa, Inqilabi Sha'ir... Nazim Hikmat", Irtekaaz, Karachi 2003, 3-4, p. 36.